

حضرت مجددؒ کا سیاسی ماحول

پروفیسر عبدالقدیر سلیم

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ 'جو بعد میں مجددؒ الف ثانی کے نام سے مشہور ہوئے' بلاشبہ بر عظیم میں سترھویں صدی عیسوی کی عظیم ترین فکری شخصیت تھے۔ میں نے ان کے لیے "فکری شخصیت" کی اصطلاح استعمال کی ہے حالانکہ عموماً انھیں ایک صوفی اور مذہبی پیشوا کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ اگرچہ تذکرہ نگاروں نے جہاں ان کی مذہبی خدمات کا ذکر کیا ہے، وہاں حیات و کائنات اور مذہب و مابعد الطبیعیات کے مشترکہ مسائل پر ان کے نقطہ نظر کی بحث بھی ضرور آئی ہے، تاہم اس پہلو کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ متقاضی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہ استثنائے چند، مسلم فکر و فلسفہ کی تاریخوں میں ان کا نام نہیں ملتا۔ تاہم مسلم فکر کے ایک سنجیدہ طالب علم کو اس باب میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مجددؒ کی اصلاحی مساعی کا دائرہ ہمہ گیر تھا۔ انھوں نے مذہب کے متوازی چلنے والے تصوف کے دائمی و حارے کو، خس و خاشاک اور اسلام کے مزاج کے خلاف آمیزشوں سے پاک کر کے، ایک چشمہ صافی بنانے کی کوشش کی، اور اس سلسلے میں نہ صرف اعمال و وظائف اور معمولات صوفیہ کو سنت نبویؐ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، بلکہ اس کے لیے ایک فکری بنیاد بھی فراہم کی۔ ساتھ ہی اپنے عہد کے سیاسی ماحول کی اصلاح کی بھی نہایت تندہی سے کوشش فرمائی، کیونکہ وہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے کہ عوام اپنے بادشاہ کے دین و مسلک کے پیرو ہوتے ہیں۔

حضرت مجددؒ نے مغلوں کا عہد پایا۔ ہندستان میں مغل سلطنت کا بانی بابر تھا، جس نے ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس طرح ہندستان میں سلاطین دہلی کا دور ختم ہوا اور مسلمان بادشاہوں کا آخری، خاندان برسر اقتدار آیا۔ بابرؒ جسے چغتائی ترک کہا جاتا ہے، امیر تیمور کی نسل سے تھا۔ یہ لوگ اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے منگول (مغل) تھے، تاہم ۳۰۲ برسوں میں تاتاریوں کی پہلی سی وحشت باقی نہ رہی تھی۔ بابر پڑھا لکھا شخص تھا، علم و ادب کا قدر دان تھا، خود بھی شعر کہتا اور نثر لکھتا تھا۔ یہی حال اس کے بیٹے ہمایوں کا تھا، جس نے اپنی فطری تن آسانی، کچھ نااہلی اور اپنے

حرف شیر شاہ کی زیر کی اور عالی حوصلگی کی بنا پر ۱۵۴۰ء میں اس کے ہاتھوں شکست کھائی اور ایران چاکر بنا گیا۔ یہاں تک کہ شیر شاہ کے نائل جانشین ۱۵۵۵ء میں اس سے مقابلے میں دہلی کی سلطنت گنوا بیٹھے اور پر عظیم کے بڑے علاقے پر پھر سلطنت منقلبہ قائم ہو گئی۔ مغلوں کے ہندوستان پر قابض ہونے کے صرف ۳۸ سال بعد حضرت مجددؒ کی ولادت ہوئی ہے۔

ہمایوں بھی خود صاحب علم اور علم و حکمت اور فنون کا قدر رواں تھا۔ اپنے قیام ایران کے دوران اس نے بہت سے ایرانی علما اور امرا سے تعلقات پیدا کر لیے، جو اس کے ساتھ ہندوستان آئے۔ ان میں سے بیشتر شیعہ تھے۔ بعض لوگوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ ایران کے پادشاہ، شاہ محمد علی نے تقریباً ڈیڑھ سل ہمایوں کی مصلحت نوازی اور پھر مراجعت ہند کے موقع پر اس کی مدد اس لیے کی تھی کہ اس کے ذریعے ہندوستان میں شیعہ اثرات پھیل سکیں گے۔ اور یہ کہ خود ہمایوں نے بھی شیعہ عقائد اختیار کر لیے تھے۔ اس سلسلے میں اس سے ایک رباعی بھی منسوب کی جاتی ہے، جس میں وہ خود کو ”بندۃ اولاد علیؑ“ اور حضرت علیؑ کی یاد پر مسرور بتاتا ہے۔ اس کا وزیر اور اس کے جانشین اکبر کا اتالیق بیروم خان (جس نے اکبر کے ابتدائی عہد میں جب وہ ایک نو عمر لڑکا تھا، اس کی طرف سے مغل سلطنت کا انتظام کیا) خود شیعہ تھا۔ اس طرح مغل حکومت کو اپنے ابتدائی دور ہی سے امرا، وزرا، اہل علم و دانش، نیز انتظامی اہل کاروں میں ایک کثیر تعداد میں شیعوں کا تعلق حاصل رہا۔ اس سلسلے میں سلوات پارہہ کا ذکر نامناسب نہ ہو گا، جو بہت بعد میں، یعنی اورنگ زیب عالم گیر کے عہد حکومت میں بھی (جن کے بارے میں عام خیال ہے کہ انہوں نے شیعہ اثرات کو کم کرنے کی کوشش کی) عروج و اقتدار کے منصب پر فائز رہے۔ بہر حال، ابتدائی ہی سے مغل سلطنت میں ایک شکن دار اور باہمی تنزیہ و تمدن اور ثقافت کے لحاظ سے ایک پر رونق سلطنت بننے کے جراثیم موجود تھے۔ اکبر، یعنی سلطنت منقلبہ کے بانی کا پوتا حضرت مجددؒ الف بانی کا پہلا ہم عصر پادشاہ ہے۔

سلطنت منقلبہ کی علم دوستی اور علم پروری کے باوجود (بیشتر مغل پادشاہ، سلطنت کے بانی بابر کی طرح یا تو خود شعر کہتے تھے، یا شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے اور یہ روایت سلطنت کے آخری لہجہ دار بہادر شاہ ظفر تک قائم رہی) اور اس امر کے باوجود کہ مغلوں نے ہندوستان میں بہت سی ہندو ریاستوں کا خاتمہ کر کے انھیں نام نہاد ”اسلامی ریاست“ میں شامل کر لیا تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ علما اور صوفیا کی بڑی تعداد یا تو سلطنت منقلبہ سے خوش نہ تھی، یا کم از کم ان کا رویہ سرد مری کا تھا۔ جب ۱۵۲۶ء میں پانی پت میں بابر کے ساتھ ابراہیم لودھی کا مقابلہ ہوا تو بابر اور ہمایوں کے ہم عصر بزرگ، شیخ عبدالقدوس گنگوہی بذات خود ابراہیم لودھی کے لشکر میں مقیم تھے۔

ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد یہ گرفتار کیے گئے، اور ان کے ایک یا دو مریدوں کو بھی گرفتار کیا گیا اور

ان کے گلے میں مرشد کی سیاہ پگڑی ڈال کر انہیں باندھ دیا گیا۔ شیخ کو حکم دیا گیا کہ لشکر کے ساتھ پاپیادہ چلیں، چنانچہ اسی حالت میں وہ پانی پت سے وہلی آئے، اگرچہ بعد میں انہیں رہا کر دیا گیا، تاہم اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شیخ کے مریدوں اور معتقدین کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کیا ہوگی۔

مغل سلطنت اپنی تمام شان و شوکت، علم و فن کی سرپرستی اور جاہ و جلال کے باوجود، ابتدا ہی سے ایک خالص غیر مذہبی حکومت تھی۔ ایک آدھ استثنیٰ کے علاوہ اس کے تمام بادشاہوں میں سے نوشی، لذت، کوشی اور نفس پروری، اسراف اور نمود و نمائش، قتلوت و بے رحمی، سلطنت و اقتدار کے لیے باہمی چپقلش کی مثالیں ملتی ہیں۔ غرض یہ تھی وہ سلطنت جس کے عین عنوان شباب میں حضرت مجدد کا ظہور ہوتا ہے۔

حضرت مجدد نے دو مغل بادشاہوں کا عہد دیکھا، اکبر اور جہاں گیر۔ ان دونوں بادشاہوں کے ادوار کو مزید دو زمانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اکبر کا وہ عہد، جب وہ بقول مورخین علمائے اسلام سے مدظن نہ تھا، اور شعاثر اسلام کو مٹانے کے درپے نہ ہوا تھا۔ اس کا دور مراد دور وہ ہے، جب بعض علماء۔ یہ ’ز‘ اور شاید مقتدر ہندو امرا اور ہندو رعایا کے عام تاثرات کے پیش نظر اس کے سر میں یہ خبط سلایا تھا کہ وہ اللہ کا کوئی اوتار یا خاص بندہ ہے، اور اب اس کے ڈسے یہ کلام ہے کہ وہ ایک نئے مذہب، نئی ثقافت اور نئی تہذیب کی بنیاد ڈالے، جو عوام کو روایتی مذہبوں، خصوصاً اسلام، کے تنگ کوچے سے نکل کر روشن خیالی اور وسیع المشہلی کی شاہراہ پر ڈال دے۔

حضرت مجدد کے حوالے سے اکبر کے جانشین جہاں گیر کے دور حکومت کو بھی دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، یعنی سن جلوس (۱۶۰۸ء) سے ۱۶۱۹ء تک جب کہ اس نے حضرت مجدد کو دربار میں طلب کیا، اور ۱۶۱۹ء سے اس کی موت (۱۶۲۷ء) تک۔

اکبر کا عہد، حضرت مجدد کی جوانی کا عہد تھا۔ وہ اس کے سال جلوس کے آٹھویں سال پیدا ہوئے۔ ان کا لڑکپن، اکبر کی حکومت کا ابتدائی دور تھا، جب وہ مغل سلطنت کو دوبارہ منظم اور مستحکم کرنے میں مصروف تھا، اور اس سلسلے میں اس کی دلچسپیاں اور مصروفیات، عام بادشاہوں جیسی تھیں۔ اس نے مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی، بلکہ شاید رسمی تعلیم کے نہ ہونے کے احساس کی بنا پر وہ علا کا اوب کرتا تھا۔ اپنی علمی استعداد کو بڑھانے کے لیے اس کے لیے یہ تو ممکن نہ تھا کہ رسمی طور پر تحصیل علم اور درس میں مشغول ہو جاتا، اس نے اپنے ارد گرد علا اور لال کھل کو جمع کیا، اور اس طرح اپنے علمی افق کو وسیع کرنے کی کوشش کی۔ ان کے خیالات غور سے سنتا اور مختلف موضوعات چھیڑ کر ان میں مباحثہ کراتا۔ مذہبی علوم سے اکبر کے اس شغف کے نتیجے میں علماء اس سے قربت کی خاطر ایک دوسرے کو بچا دکھانے پر تل گئے۔ اس نے ’مہلوت خانے‘ کی جو عمارت مذہبی اور متعلقہ سلمی و ثقافتی امور پر بحث و تمحیص کے لیے بنائی تھی، ایک

مستقل مناظرے کا اڈا بن گئی۔ اکبر ان لوگوں سے کچھ ایسا بدظن ہوا کہ اسے اسلام کی صداقت اور حتمیت پر یقین نہ رہا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کا رویہ اسلام اور اہل اسلام کے لیے معاندانہ ہو گیا۔ پہلے تو دربار میں شیخ وقتہ نماز کا اہتمام کیا جاتا تھا اور اب یہ صورت حل ہو گئی کہ کسی کو مجاہد نہ تھی کہ علانیہ دیوان خانے میں نماز ادا کرے۔ اکبر کی گمراہیوں اور اسلام اور اسلامی شعائر سے اس کی کد کی بہت تفصیلات اب سامنے آچکی ہیں جنہیں یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان تفصیلات کو محض عبدالقادر بدایونی کے تعصب پر محمول کرنا کسی طرح بھی درست نہ ہو گا اور یہ بھی کہ اکبر محض ایک ”روشن خیال“ یا ”آزاد خیال“ انسان تھا جسے مذہب سے کوئی لگاؤ نہ تھا، صحیح نہیں ہے۔ اکبر نے آخر تک گہرے مذہبی شغف کا ثبوت دیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا یہ مذہب اسلام نہ تھا بلکہ ایک طرح سے اسلام کے خلاف عداوت اور بغض کا رنگ لیے ہوئے تھا۔

اس طرح کے سیاسی ماحول میں حضرت مجددؑ نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ یہ ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا، میں بائیس سال کی عمر میں وہ درسیات سے فارغ ہو کر خود سرہند میں تدریس میں مصروف ہو گئے تھے اور اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد وہ اکبر آبدو پہنچے اور وہاں کوئی آٹھ نو سال قیام کیا۔ اس قیام میں انہیں براہ راست حکومت کی پالیسی کا مشاہدہ کرنے اور امرا اور اہل دربار کے خیالات معلوم کرنے کا موقع ملا۔ زبدۃ الحقائق سے جو حضرت مجددؑ کی پہلی سوانح حیات ہے، پتا چلتا ہے کہ اکبر کے معتد امرا، ابو الفضل اور فیضی کے ہاں بھی حضرت مجددؑ کا آنا جانا تھا، ابو الفضل ان کی علمیت کا قدر دان تھا۔ لیکن مذہب کے معاملے میں آزاد خیال واقع ہوا تھا۔ شیخ مجددؑ کی سوانح کے مصنف خواجہ ہاشم کشمی لکھتے ہیں:

ابو الفضل کا ایک مصاحب مجھ سے کہتا تھا کہ ایک دفعہ تمہارے مرشد (حضرت مجددؑ) ابو الفضل کی مجلس میں حاضر تھے۔ اس وقت ابو الفضل نے فلسفیوں اور ان کے علوم کی تعریف شروع کی اور اس میں اس طرح مبالغہ کیا کہ علمائے اسلام کی توہین منہوم ہوتی تھی۔ حضرت شیخ سلمہ اللہ تعالیٰ سے نہ رہا گیا اور انہوں نے فرمایا کہ امام غزالی قدس سرہ نے رسالہ شریفہ منقذ (المنقذ) من الضلال میں لکھا ہے کہ جن علوم کی ایچلو کا فلسفی دعویٰ کرتے ہیں، ان میں سے جو کام کے ہیں، مثلاً ہیئت، نجوم، طب، وہ انہوں نے قدیم انبیاء کی کتابوں اور ان کے کلام سے چرائے ہیں اور جو ان کی اپنی ایچلو ہیں، مثلاً ریاضی وغیرہ، وہ کسی دینی کام کے نہیں۔ ابو الفضل یہ سن کر جوش میں آ گیا اور کہنے لگا، غزالی نے ہاں مقول بات کہی ہے۔ حضرت شیخ نے اس بات سے بڑا برا مانا، فوراً ابو الفضل کی مجلس سے اٹھے اور فرمایا کہ اگر اہل علم کی صحبت کا شوق ہے، تو اس طرح بے ادبی کے الفاظ زبان سے نہیں نکلنے چاہئیں۔ یہ کہہ کر وہ مجلس سے باہر چلے گئے اور پھر کئی روز تک ابو الفضل کے

پاس نہ گئے، حتیٰ کہ اس نے آدمی بھیج کر معذرت چاہی اور انہیں بلا بھیجا۔

اس کتب سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ انہوں نے فیضی کی مشہور بے نقط تفسیر سواطع الانہام میں بعض مقالات پر اس کی مدد کی تھی۔ غالباً اسی قیام اکبر آباد میں ابو الفضل یا بعض دوسرے آزاد خیال اہل علم سے نبوت کے معاملے میں حضرت مجددؑ کا اختلاف رائے ہو گیا۔ یہ لوگ بظاہر عقل کو غلطی حقیقت تک پہنچنے کے لیے کافی خیال کرتے تھے اور الہامی ہدایت کی ضرورت کے منکر تھے۔ حضرت مجددؑ نے وسیعہ اثبات النبوة تصنیف کیا، جو غالباً ان کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کی تمہیدی عبارت میں لکھتے ہیں:

میں نے بعض لوگوں سے مناظرہ کیا، جنہوں نے علم فلسفہ پڑھا تھا، اور کافروں کی کتابوں سے بہرہ یاب ہو کر فضل و تعیلت کے مدعی ہو گئے تھے۔ انہوں نے لوگوں کو گمراہ کیا اور اصل نبوت کے تحقیق اور ایک خاص شخص کے لیے اس کے نبوت میں خود بھی گمراہ ہوئے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے ”ایک خاص شخص“ سے حضرت مجددؑ کی مراد اکبر ہے۔ یہاں ان کا اشارہ اس طرف ہے کہ پادشاہ کے نقطہ نظر اور رجحان کی مناسبت سے بعض اہل علم، نبوت کی حقیقی حکمت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قیام اکبر آباد اور آگرہ کے دوران حضرت مجددؑ نے زیادہ تر درس و تدریس اور علمی محفلوں میں گفتگو کے ذریعے ہی اپنے متوسلین، شاگردوں اور امرائے دربار کو اپنے نقطہ نظر سے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ اس مرحلے پر وہ کسی نظریاتی تصادم کے لیے تیار نہ تھے۔ تاہم اس قیام کے تعلقات بعد میں عہد جہاں گیر میں کام آئے۔

اکبر کی اس پالیسی سے نہ صرف علمائے حق اور عام مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھلائی گئی، بلکہ راج العقیقہ امرا اور حکام کے بارے میں بھی یہ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس کے ہم خیال اور ہم مشرب ہوں گے۔ اگرچہ یہ ناراضی، ایک مطلق العنان اور طاقت ور حکمران کے وزن تلے بے بسی کے ساتھ دبی ہوئی تھی، لیکن کبھی کبھی اس کا ظہور ہو ہی جاتا تھا۔ چنانچہ جب خود اس کے مقرر کردہ ”صدر چھوہر“ ملا محمد یزدی (شیعہ) نے اس کے دشمن اسلام ہونے کا فتویٰ دیا، تو کئی امرا اکبر کے خلاف ہو گئے۔ ان میں محمد معصوم کابلی، میر معز الملک (میر قاضی بنگل)، نیابت خاں، عرب بلور اور کئی دوسروں نے مسلح بغاوتیں کیں۔ بنگل میں پٹا خاں جہاری، اور وزیر جمیل کی سرکشی، نیز مرزا محمد حکیم کابلی کی بغاوت کی وجہ سے اکبر کی حکومت کے خلاف ایک عام فضا ہو سکتی ہے۔ ان مختلف شورشوں سے اکبری حکومت کے خلاف ایک عام بغاوت کا سا سہا ہوا پیدا ہو گیا تھا، اور اسی لیے ۱۵۸۶ء کو بعض سورخ اس کے دور کا تازک زمانہ بتلاتے ہیں، جب کہ اس کا سنگم سن ڈول رہا تھا۔ اس کے لاڈلے اکلوتے اور سرکش بیٹے شہزادہ سلیم نے حالات سے فائدہ اٹھانے میں کمر نہ چھوڑی تھی، اور خود اپنے باپ کے خلاف صف آرا ہو گیا تھا۔ ابو الفضل نے اس طرح کی شورشوں

کے بارے میں لکھا ہے کہ ہندوستان کی خوش گوار فضا اختلاف کے عہد سے آلود ہو گئی ہے۔

اکبر اگرچہ ساری بغاوتوں کو فرو کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے شہنشاہ کی حیثیت سے بستر شاہی پر جان دی، تاہم اس کے بااثر امراء گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ بعض اس کے بیٹے سلیم کو سلطنت مغلیہ کا بادشاہ دیکھنا چاہتے تھے، اور بعض اس کے پوتے خسرو کو۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بستر مرگ پر اکبر اپنے بیٹے سے بہت زیادہ خوش نہ تھا۔ تھوڑا ہی عرصہ پہلے اس نے باپ کے خلاف کھلی بغاوت کی تھی اور اس کے ایک چہیتے درباری امیر ابو الفضل کو قتل کرا دیا تھا جس کا اکبر کو دلی صدمہ تھا۔

تحت نشینی کی اس کش مکش میں شیخ فریدؒ بخاری نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اکبر کا رضاعی بھائی خان اعظم مرزا عزیز کو کہہ جو اس کا عزیز دوست اور اہم درباری تھا، شہزادہ خسرو کے حق میں تھا، شہزادہ سلیم کا بیٹا عزیز کو کہہ گا دلدادہ بھی تھا۔ ایک اور اہم درباری امیر راجا مان سنگھ بھی خسرو کا حامی تھا۔ ان دونوں نے اکبر کے آخری ایام میں شہزادہ سلیم کے بیٹے کو تخت دلانے کی جڑی کوشش کی لیکن آخر کار دوسرا گروہ کامیاب ہوا جو شہزادہ سلیم کے حق میں تھا۔ اس گروہ میں پیش پیش شیخ فریدؒ تھے جو حضرت خواجہ باقی باللہ کے ارادت مند اور ان کی دہلی کی خانقاہ باقویہ کے کفیل تھے اور انھی کے ذریعے حضرت مجددؑ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے تھے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ مکتوبات مجددؑ الف بھائی میں سب سے زیادہ خطوط انھی کے نام ہیں۔ شیخ فریدؒ نے شہزادہ سلیم کے حق میں دوسرے امراء کے علاوہ مقتدر سلاطین پارہہ کی حمایت حاصل کرائی۔ "امراء نے آخر کار فیصلہ کیا کہ حکومت اسی کو دینی چاہیے جو اس کا قانونی حق دار ہے۔ چنانچہ ایک برگزیدہ امیر جسے دوسروں نے اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا، شہزادے (جہاں گیر) کے پاس آیا اور امراء کی طرف سے اسے پیغام دیا کہ ہم سب آپ کی بادشاہت کی حمایت کریں گے بشرطیکہ آپ اس بات کی قسم اٹھائیں کہ آپ شرع محمدیؐ کا تحفظ کریں گے اور اپنے بیٹے (خسرو) یا اس کے طرف داروں کو کوئی سزا نہ دیں گے۔ شہزادے نے ان شرطوں کو پورا کرنے کی قسم اٹھائی اور بہت سے پسرے داروں کے ساتھ اپنے باپ کی ملاقات کو روانہ ہوا۔"

حضرت مجددؑ کو ہٹا چلا گئے بادشاہ نے اسلام کی حفاظت و نصرت کا عہد کیا ہے، تو فطری طور پر انھیں مسرت ہوگی۔ اس کا اظہار انھوں نے شیخ فریدؒ ہی کے نام ایک مکتوب میں کیا ہے:

آج کہ دولت اسلام کی ترقی اور بادشاہ اسلام کی تحت نشینی کی خوش خبری خاص و عام کے کانوں میں پہنچی۔ اہل اسلام نے اپنے اوپر لازم چاہا کہ بادشاہ کے مددگار و معاون ہوں اور شریعت کے رواج دینے اور مذہب کے تعویث دینے میں اس کی مدد کریں۔ یہ فقیر بے سرو سامان بھی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو دولت اسلامیہ کے مددگار گروہ میں داخل کرے اور اس بارے میں کوشش کرے۔

اس خط میں حضرت مجددؒ نے اس مقتدر امیر کو اصلاح حکومت اور حکمران کی طرف متوجہ کیا ہے کہ دونوں میں گہرا تعلق ہے۔ ”بادشاہ کی نسبت جہان کے ساتھ ایسی ہے، جیسے قلب لی بدن کے ساتھ، اگر قلب اچھا ہے تو بدن بھی اچھا ہے، اگر قلب بگڑ جائے تو بدن بھی فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔“ نیز یہ کہ گمراہ، جاہل صوفیا اور علمائے دنیا (علمائے سو) کس طرح امت کے بگاڑ کا سبب بنتے ہیں۔ آخر میں لکھتے ہیں: ”آپ کی جناب شریف سے امید ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آپ کو بادشاہ کا قرب پورے طور پر بخشا ہے تو شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے رواج دینے میں ظاہر و باطن کو شش کریں گے اور مسلمانوں کو غریبی سے نکالیں گے۔“

نسبتاً متوازن امرانے جہاں کیر کے حق میں اپنا وزن ڈال کر اسے بادشاہ بنایا، اور حضرت مجددؒ نے اس پر اظہار مسرت فرمایا، تو اس کی حقیقی وجوہ بھی تھیں۔ بادشاہت کے اس نظام میں یہ تو ممکن نہ تھا کہ کسی صلاح شخص کو جو نسلاً تخت کا ”حق دار“ نہ تھا، بادشاہ بنا دیا جائے۔ خسرو، اور سلیم، انتخاب انھی دو میں ہو سکتا تھا اور سلیم اپنے باپ اکبر کی پالیسی سے بظاہر ناراض اور غیر مطمئن نظر آتا تھا، اس لیے اس کے حق میں وزن ڈالا گیا۔ پھر، جیسا کہ اس کی بعد کی کارکردگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال بھی تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے متعدد احکام کے ذریعے مرسوں، سرے خاوں کو کٹوؤں کی تعمیر کا حکم دیا، بعض محمول معاف کیے، دلوری کے لیے اپنی مشہور ”زنجیر عدل“ لگوائی، اور اس طرح خود کو ایک عوام دوست، غریب پرور اور عدل مستر بادشاہ کے طور پر پیش کیا۔

حضرت مجددؒ کی کوشش تھی کہ مسلمانوں کی حکومت ایک شرعی اور اسلامی حکومت بن جائے۔ اس مقصد سے انھوں نے کئی امرانے کے نام مکتوبات لکھے۔ انھی میں سے ایک مکتوب میں وہ لکھتے ہیں: ”اب جب کہ حکومت کی طرف سے اسلام کے لیے عدل کی پالیسی بظاہر تبدیل ہو گئی ہے، امرا، علما اور اسلام کے عظیم فرزندوں کا فرض ہے کہ قانون شریعت کے نفاذ کی جدوجہد کریں۔“ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ اکبر کے جانشین جہاں کیر نے اسلام اور شعائر اسلام کے بارے میں وہ معاندانہ روش نہ اختیار کی، جسے اس کے باپ نے رواج دیا تھا، مگر مثبت طور پر اس نے اسلام کے حق میں اپنی مطلق العنان حیثیت کو کہیں استعمال نہیں کیا۔ یوں شریعت اسلامی کے رواج پانے کی آرزو جس کے لیے علمائے حق کوشش تھے، پوری نہ ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اور بادشاہوں کی طرح ایک بادشاہ تھا، جس کے پیش نظر اپنی موروثی سلطنت کے قیام و استحکام اور اپنی ذاتی بقا کے کچھ مصالح تھے۔ اپنی تخت نشینی کے موقع پر اس نے مناسب سمجھا کہ اس گروہ امرا کو استعمال کرے، جن میں کچھ دینی حیثیت ہے، اور وہ اکبر کے مذہبی نظریات سے اتفاق نہیں کرتے، لیکن یہ اس کی ذاتی مصلحت اور حکمت عملی تھی۔ نفاذ اسلام کے لیے اس کے دل میں کوئی استغاب اور خواہش نہ

تھی۔ کیونکہ بعد میں اس کے اقوال، تحریریں اور اعمال اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ ”سلطان اسلام“ دراصل ایک مثل حکمران کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دربار کے بہت سے آداب، جو سراسر غیر اسلامی تھے، جنوں کے توں قائم رہے۔ سجدہ تعظیم، بدستور باقی رہا، دربار کے تزک و احتشام، محلوں کے مسرفانہ اخراجات جنوں کے توں قائم رہے۔ اس کی اوباشی اور شراب نوشی میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اپنی زندگی سے ہٹ کر نظام حکومت میں بھی کوئی بنیادی تبدیلی کا دور دور پتا نہیں چلتا۔ غیر مسلموں پر جزیہ عائد نہ کیا گیا، زکوٰۃ کا نظام قائم نہ ہوا، عہد اکبری میں برباد کی ہوئی مساجد اسی طرح ٹوٹ کنٹن رہیں، گاؤں کشی پر پابندی بدستور باقی رہی۔

جہاں گیر نے ”آئین اکبری“ کو بحال رکھا، گویا دستور حکومت وہی تھا، جو ابو الفضل جیسے ضل اور مضل نے مرتب کیا تھا، اور جس پر اس کے والد ماجد نے اپنے عمل کی مرثیت کی تھی۔

جہاں گیر کے بادشاہ ہونے سے کوئی حقیقی سیاسی تبدیلی نہیں آئی۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ ”سلطان اسلام“ نور الدین جہاں گیر کا دور سیاسی لحاظ سے کسی بھی طرح اکبر سے مختلف نہیں۔ جلد ہی یہ بات ایک واضح حقیقت کے طور پر حضرت مجددؑ پر عیاں ہو گئی۔

حضرت مجددؑ حکومت کی پالیسی سے نہایت دل شکستہ ہو چکے تھے، اور ان کا ذہن اس سلسلے میں نہایت صاف تھا کہ ظواہر کی بعض تبدیلیوں کے باوجود، حکومت کی روح وہی ہے، اور اس کے مظاہر بھی عام مشاہدے کی بات ہیں۔ قابل غور یہ امر ہے کہ اب جس مکتوب کا میں حوالہ دینے جا رہا ہوں، وہ دفتر دوم کے آخری حصے کا مکتوب ہے۔ یہ جہاں گیر کی تخت نشینی کے ۱۰، ۱۱، ۱۲ سال بعد کا زمانہ ہو گا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مجددؑ کے پاس اب اتنے شواہد آچکے تھے کہ جہاں گیر کی ملک گیری کے بارے میں اب کسی خوش فہمی کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

روشن شریعت کی ترقی و رواج، شاہان بزرگ کے حسن انتظام پر موقوف ہے۔ جب سے یہ امر ضعیف ہو گیا ہے، کفار ہند بے تحاشا مسجدوں کو گرا کر وہاں اپنے معبد و مندر تعمیر کر رہے ہیں، چنانچہ تھانیسو میں ایک مسجد اور بزرگ کا مقبرہ تھا، اس کو گرا کر اس کی جگہ ایک بڑا بھاری مندر بنا دیا گیا ہے۔ کفار تو علانیہ اپنی رسمیں بجالا رہے ہیں، اور مسلمان اکثر احکام اسلامی کے جاری کرنے میں عاجز ہیں۔ ایکوشی کے دن ہندو کھانا ترک کر دیتے ہیں۔ بڑی کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی شہروں میں کوئی مسلمان اس دن روٹی نہ پکائے اور نہ بیچے۔ اور ماہ رمضان میں علانیہ تان و طعام پکاتے اور بیچتے ہیں، مگر اسلام کے مغلوب ہونے کے باعث کوئی نہیں روک سکتا۔ ہاے افسوس! بادشاہ وقت ہم میں سے ہو، اور پھر ہم فقیروں کا حال اس طرح خست و خراب ہو.....

بعض مصنفین نے اس مکتوب کو دور اکبری میں اسلام کی اتری کی طرف اشارہ قرار دیا ہے، جو درست نہیں، یہ دور جہاں گیری کے وسط کا خط ہے۔

ان سیاسی حالات میں غالباً حضرت مجددؑ حکومت کی خیر کی طرف تبدیلی اور پیش رفت سے مایوس ہو چکے تھے، تاہم وہ اپنے حلقے میں بااثر لوگوں کو بار بار ترویج شریعت کی طرف متوجہ کرتے رہے، اور اصلاح و تبلیغ کے معروف طریقے پر بھی گامزن رہے۔ اپنے مریدوں اور خلفاء کو انہوں نے آکناف سلطنت میں پھیلا دیا (جسے جہاں گیری توڑک میں ”مکاری اور فریب کا جہل“ قرار دیتا ہے)۔ افغانستان، توران، بدخشاں سے لے کر (جہاں اب بھی مجددی سلسلے کا کافی اثر موجود ہے) وسط ہند اور دکن تک حضرت مجددؑ کے خلفائے عوام کے علاوہ عساکر میں بھی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا۔ کہتے ہیں عبداللہ خان ازبک تورانی (شمال کے علاقے کا حکمران) بھی غالباً حلقہ ارادت میں شامل ہو گیا تھا۔ انھی تبلیغی مساعی اور ان خطوط کی بنا پر جو وہ امر اور علما کو اکٹھا لکھا کرتے، اور ان میں تبدیلی اور اصلاح حل کی طرف متوجہ کراتے تھے، غالباً جہاں گیری ان سے کھٹک گیا۔ دکن میں میر نعمان کے ذریعے سلسلہ نقشبندی کی مقبولیت کی بنا پر شاید اس نے فوج میں حضرت مجددؑ کے اثر و نفوذ میں خطرے کی بوس لگی تھی، یا دوسروں نے اسے یہ پلور کرایا تھا، بہر حال وہ ان مساعی کو خطرے کا نشان سمجھتا تھا۔ اس نے ان کے مشہور مرید میر نعمان کو دارالحکومت طلب کیا، اور دربار اور لشکر سے علیحدہ نہ ہونے دیا۔ بیحد یہی سلوک وہ حضرت مجددؑ سے بعد میں کرنے والا تھا۔

میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ دہلیوں کے عہد سے ہندستان میں حکومت کے اندر اور باہر بھی شیعہ اثرات میں معتد بہ اضافہ ہونے لگا تھا۔ اکبر کے عہد میں بھی اس میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ جہاں گیری کی محبوب بیوی (پہلی پادشاہ بیگم) جس کا نام سکہ پر ڈھالا گیا، شیعہ تھی۔ اس کا بھائی آصف جاہ نہایت بااثر وزیر تھا، اور یقیناً ایرانی شیعہ اثرات میں اضافہ ہوا تھا۔ حضرت مجددؑ نے متعدد مکتوبات میں رافضی اثرات میں اضافے پر تشویش کا اظہار کیا ہے (وہ ایک مستقل رسالہ در رد و افاض / کوائف شیعہ) بھی لکھ چکے تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ جہاں گیری کو حضرت مجددؑ کے خلاف اکسانے میں یہ عوامل بھی شامل ہوں۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں جہاں گیری نے اپنے ۱۳ ویں سال جلوس میں حضرت مجددؑ کو دربار میں طلب کیا اور مختصر سی پوچھ گچھ کے بعد انہیں گوالیار کے قلعے میں اسیر کر دیا، جہاں عموماً سیاسی قیدی نظر بند کیے جاتے تھے۔ (۱۶۰۳ء/۱۶۱۹ء)

اس سے خود اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اکبر کے زمانے کی یہ نسبت اسلام کے حق میں دربار کی فضائیں قدر ”ہموار“ ہوئی تھی، اور اسلام و شریعت اور مسلم عوام کا درد رکھنے والوں کے لیے حکومت کی پالیسی کیا تھی۔ ان بااثر درباریوں کے ہوتے ہوئے بھی، جن کے ساتھ حضرت مجددؑ کی مراسلت تھی، اور جن کا ذکر

پہلے آچکا ہے، بادشاہ اس مرد درویش کے ساتھ انتہائی گستاخی اور بد تمیزی کا سلوک کرتا ہے، لیکن مغلوں کی سخت گیر اور منتقمانہ شخصی حکومت کے آگے، جس میں شورش پسند شتراوے تو ایک طرف رہے، باپ بیٹوں اور بھائیوں تک میں عموماً شک و شبہ کی فضا قائم رہتی تھی، کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی۔

یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ بعض بااثر امرانے مناسب وقت اور موقع تلاش کر کے رہائی کی سفارش کی ہو، اور جب بادشاہ نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ فی الواقع حضرت مجددؑ کے پاس کوئی سیاسی قوت نہیں ہے، یا اگر ہے، تو وہ اسے استعمال نہیں کرنا چاہتے، اور اس طرح وہ اس کی حکومت کے لیے کوئی خطرہ نہیں، تو اس نے کوئی ایک سال بعد انھیں رہا کر دیا۔ اس رہائی کا اندراج بھی توڑک میں درج کرتا ہے، لیکن اس کی تحریر کی بیسوگی اور ہتک آمیز زبان سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ ان کا معتقد یا مرید ہو گیا تھا، جیسا کہ ابتدائی تذکرہ نویسوں اور بعد میں انھیں بلا تفریح نقل کرنے والوں نے لکھ دیا ہے۔

پروفیسر محمد فرمان لکھتے ہیں: ”جہاں گیر نے انھیں رہا کرنے کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ ”ور رفتن و بودن مختار گردانندم“۔ یعنی میں نے اختیار دیا کہ چاہیں ساتھ رہیں یا چلنے جائیں۔ لیکن یہ بات بھی جہاں گیر کی اور کئی باتوں کی (طرح) بصوت سے لبریز اور مفید حکمت عملی کا ایک شاہ کار ہے۔ (صرف نظربندی نہیں رکھا، بلکہ ان کے مال و اسباب کتابوں اور جائیداد کو بھی شدید نقصان پہنچایا ہے۔ جیسا کہ لرقاری کے وقت اپنے صاحب زادے محمد معصوم کو لکھے گئے خط سے ظاہر ہوتا ہے، مکتوبات، سوم، مکتوب ۲)۔ اس میں یہ تلقین کی ہے کہ راضی بہ رضا رہیں اور اپنی والدہ سے بھی یہی کہیں۔ یہی نظربندی حضرت مجددؑ کی عظمت کی دلیل اور ان کی شخصیت کے کمال کی دلیل ہے، جسے ارادت مندوں نے اپنی غلطی سے حضرت کے علوشان کے منافی سمجھ کر سو جیلوں بہانوں سے چھپانا چاہا ہے، اور جہاں گیر کو حضرت کا مرید ظاہر کر کے ان کی عظمت کا اظہار کیا ہے۔“ لیکن اس بات کو نظر انداز کر گئے ہیں کہ جہاں گیر کے مزاج میں کوئی ایسی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ وہ آخری دم تک شراب کا رسیا اور عیش و عشرت کا دلدادہ رہا ہے، اور ہمیں اس کی زندگی میں نقش بندی مرید کے کوئی واضح آثار نہیں ملتے، اور ان آثار کی عدم موجودگی میں اسے حضرت کا مرید خاص قرار دینا، ایک طرح سے حضرت کے فیض اور تصرف باطنی کا انکار کرنا ہے، جو تاریخی شواہد کی روشنی میں محل نظر ہے۔“ تاہم پروفیسر فرمان، اس معاملے میں شیخ محمد اکرام کے ہم نوا ہیں کہ ”ان تین چار سالوں میں (جب حضرت مجددؑ اس کے لشکر کے ہمراہ تھے) جہاں گیر کو ترویج شریعت کا خاص خیال رہتا تھا، اور اس کے دل میں مذہب کا بڑا جوش تھا۔ عجب نہیں کہ اس میں حضرت کی تعلیمات کا بھی دخل ہو“۔“

”ترویج شریعت“ اور ”مذہب کے جوش“ کے سلسلے میں شیخ اکرام نے توڑک سے دو مثالیں درج کی ہیں۔ ایک علاقہ راجوری (کشمیر) کے مسلمانوں کی بعض رسوم کے بارے میں جہاں گیر کے اظہار خیال کی

اور دوسری کانگریز کے قلعے میں شعار اسلام بجالانے کی۔ راجپوتوں کے بارے میں کہتا ہے: ”پابود مسلمان ہونے کے ہندوؤں جیسی رسوم بجالاتے ہیں۔ عورتوں کو خلوند کے مرنے پر قبر میں زندہ دفن کر دیا جاتا ہے۔ ایک بارہ سالہ لڑکی کو اس کے بارہ سالہ خلوند کے مرنے پر اس کے ساتھ زندہ دفن کر دیا گیا۔ لڑکی پیدا ہونے پر اس کا گلا گھونٹ کر مار دیتے ہیں۔۔۔ ہندوؤں سے بھی رشتے داریاں کرتے ہیں۔ لڑکیاں لینا تو ٹھیک ہے لیکن لڑکیاں دینا لعنتی کلم ہے۔ میں نے حکم دیا کہ آئندہ اس رواج پر عمل نہ کیا جائے“۔

شیخ محمد اکرام اور پروفیسر فرہان کے اس نظریے کی تائید میں کہ جہاں کیر کو ترویج شریعت کا خیال پیدا ہو گیا تھا، ۱۳ ویں سال جلوس کے بعد کی پوری توجہ دیکھ جائے، کہیں اقامت صلوٰۃ، ایٹاے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام کے لیے ادارے قائم کرنے یا ان کے لیے دل سوزی کا ایک حرف نہیں ملتا۔ سونے چاندی میں تولنے، جشن منانے، بیرو شکار، تفریح، خیرات و صدقات (جو جاہل اور بد عقیدہ بھی اپنی جان، مال اور اقبل کی حفاظت کے خیال سے دیتے ہیں، کیا مسلم اور کیا غیر مسلم) حتیٰ کہ اپنے متعدد اوقات میں فصد کھولنے اور پرندوں اور جانوروں کی دوستی اور جنسی محبت تک کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتا ہے، لیکن نہ اس نے خود، اور نہ میرزا محمد ہادی نے جس نے بادشاہ کی مدیم الفرستی / کمزوری کے باعث، اس کے ۱۹ ویں جشن نوروز کے بعد روزنامے میں اندراجات کیے ہیں، حکومت کے دستور کو (جو بدستور آئین اکبری پر استوار تھا) بدلنے اور اسے اسلامیانے کے کسی اقدام کا ذکر کیا ہے۔ اس کے روزنامے میں جو ”محلۃ اللہ“، ”نعوذ باللہ“، ”اللہ تعالیٰ“، ”واللہ اعلم بالصواب“ جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، وہ بلا استثنا مذہب اس عہد کے تمام فارسی بولنے والوں میں مروج تھے اور ایک ”تمذہبی تقاضا“ تھے۔ حتیٰ کہ جہر روپ سیاسی بھی جس سے ملاقات کا اسے بار بار اشتیاق ہوتا ہے، اور ”اس کے کنج عزالت میں بیٹھ کر“ وہ ”حائق و معارف پر مبنی بہت ہی اعلیٰ گفتگو“ سنتا ہے، بادشاہ کے رخصت ہوتے وقت کہتا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ کی اس مہربانی کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ اس نے آپ جیسے انصاف پرور بادشاہ۔۔۔ کی بددلت مجھے اطمینان خاطر کے ساتھ عہدت میں مشغول رہنے کی آسانی عطا کی۔۔۔“

اسی طرح دوسرے ”اسلامی شعائر“ کے ساتھ بھی اس کی روش بڑی روایتی قسم کی ہے۔ دسویں سال جلوس کے واقعات میں وہ تفصیل سے ۱۵ سال کی عمر میں شراب نوشی کی ابتدا اور پھر اس میں بے تاملتاشا اضافے کا ذکر کرتا ہے کہ: ”دن رات میں چودہ پیالے (۶ سیر) پی جاتا تھا، بعد میں اس میں انیم کا اضافہ بھی ہوا (کہ سرور میں مزید اضافہ ہو)۔ پھر حکیم کے زور دینے پر تدریج کی، اور اب ”البتہ جمعرات کے دن دو وجوہات سے رات کی بجائے دن ہی کے آخری حصے میں پی لیتا ہوں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ جمعرات کی رات ہفتے میں سب سے مبارک رات ہوتی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اگلا دن مبارک جمعہ ہوتا ہے۔۔۔ کچھ اچھا

نہیں لگتا کہ اس رات کو یاد الہی میں مشغول ہونے کی بجائے عیش و عشرت میں پڑ کر غفلت میں بسر کروں۔ میں جمعرات اور اتوار کے دن گوشت بھی نہیں کھاتا۔ جمعرات کے دن تو اس لیے کہ اس دن میری تخت نشینی ہوئی تھی، اور اتوار کے دن اس لیے کہ میرے والد بزرگوار کا یوم ولادت ہے، اور وہ اس دن کا بہت احرام کرتے تھے....“

وہ خود شراب پینے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ”شہنشاہ اسلام“، ”امریا المعروف کافرینہ“ اس طرح انجام دیتا ہے کہ اپنے چہیتے شہزادے کو زبردستی شراب پلاتا ہے، اور وہ بھی جمعہ کے دن تاکہ ”ترویج شریعت“ اس مبارک دن سے شروع ہو۔ لکھتا ہے: ”جمعہ ۲۵ مادی کو خرم بیٹے کو تکانے کی محفل منعقد ہوئی۔ اس دن تک، جب کہ وہ اپنی عمر کے ۲۳ ویں سال میں داخل ہو گیا تھا، کئی بیویوں کا شوہر اور متعدد بچوں کا باپ ہو چکنے کے باوجود اس نے شراب چکھی تک نہ تھی۔ میں نے اس مجلس میں اس سے کہا کہ بیٹے، تو اب خیر سے صاحب اولاد ہو گیا ہے، اس لیے یہ دیکھتے ہوئے کہ ہمیشہ شاہوں اور شہزادوں نے شراب پی ہے، آج کہ تجھے تولنے کے جشن کا دن ہے، میں تجھے شراب پلاتا ہوں، اور تجھے اجازت دیتا ہوں کہ جشن کے ایام، نوروز کے دنوں اور بڑی بڑی مجلسوں میں پی لیا کرنا... غرض کہ بہت اصرار کر کے اسے شراب پلائی گئی“۔

توزک کے تتمہ نویس کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ جہاں گیر نے آخری شے جو موت سے پہلے حلق سے اتاری، وہ شراب ہی تھی۔ اس سے پہلے اس کے ایک چہیتے شہزادے پر ویز کی موت بھی کثرت شراب نوشی سے ہو چکی تھی۔ یہ شہزادہ، خرم (شاہ جہاں) کے مقابلے میں جہاں گیر کا زیادہ معتد علیہ تھا۔ ۳۸ سال کی عمر میں مرگ اور ترک غذا کے باعث اس کی موت ہوئی۔ ”یہ مرض کثرت شراب خوری سے لاحق ہوا“۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مذہبی اور سیاسی طور پر اکبر اور جہاں گیر کی پالیسی میں سوائے اس کے کوئی اور فرق نظر نہیں آتا کہ اکبر میں منافقت کم تھی، اور اسے تصوف و مذہب سے ایک خاص طرح کا شغف تھا (اسلام سے نہیں) اسلام کی جگہ لینے کے لیے اس نے ایک نئے مذہب کو ایجاد کرنے کے ناکام تجربات کیے، اور آبادی کے ایک خاصے بڑے طبقے کو ناراض کر لیا۔ جہاں گیر نے ان باتوں کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ اسے اسلام کے روایتی ثقافتی ورثے سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، کہ وہ کہیں رمضان، شبِ برات، محرم اور عید الاضحیٰ کی قربانی کا ذکر نہیں کرتا۔ وہ اگرچہ حضرت مجددؑ کو آخر کار رہا کرتا ہے، لیکن اپنی حکومت کے لیے کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ماضی میں بعض درویش اور ان کے متوسلین حکومت کے لیے پریشانیوں کا باعث بنتے رہے ہیں، اس لیے ”اختیار“ کے باوجود وہ نہایت عیاری سے انھیں لشکر میں ساتھ لیے بھرتا ہے۔

قید سے رہا ہونے کے کچھ عرصے بعد حضرت مجددؑ نے ایک خط جہاں گیر کو لکھا تھا، جس میں جنگی لشکر

کے مقابلے میں ”لشکر دعا“ کی فتوحات کو حقیقی فتوحات بتایا تھا۔ وہ متعدد مکتوبات میں اس لذت الم کا ذکر کرتے ہیں، جو اب لشکر ہی قید کی صورت میں درپیش ہے۔ کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے! اپنے بچوں کے نام ایک مکتوب میں وہ بادشاہ کے ساتھ ایک مجلس کا تذکرہ کرتے ہیں، جہاں انھوں نے بادشاہ کے سامنے اسلام کے بنیادی عقائد، بعثت انبیا، عقل کے عدم استقلال، آخرت، ختم نبوت وغیرہ بیان کیے۔ بادشاہ ساری باتیں غور سے سنتا رہا، اور بظاہر چہرے پر ناگواری یا عدم قبولیت کے آثار نہ ظاہر ہوئے۔ تاہم بادشاہ کا اختلاف نہ کرنا، محض اس لیے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ درباریوں کے سامنے کسی بحث میں الجھنا اور اکبر کے دربار جیسا سہل پیدا نہ کرنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ اس نے اپنی توڑک میں، جہاں متعدد ہندو فقیروں اور یوگیوں سے ملاقات کے اشتیاق، ملاقات کے احوال، اور گفتگو کی تفصیلات دی ہیں، اس مجلس، یا ایسی کسی مجلس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

حضرت مجددؑ نے جن عقائد اور ایمانیات کا تذکرہ کیا ہے، وہ مسلمانوں کی اکثریت میں تقریباً متفق علیہ ہیں، ان پر خاموش رہنے کا مطلب یہ نہ تھا کہ جہاں گیر نفاذ اسلام کے لیے حضرت مجددؑ کے نظریات سے ہم آہنگ ہو گیا تھا، یا دوسرے مختلف فیہ مسائل میں ان سے متفق تھا۔ حضرت مجددؑ نے بادشاہ کے ساتھ مجلس کے ذکر میں یہ نہیں لکھا کہ انھوں نے بادشاہ کو جزیہ عائد کرنے، اسلامی قوانین کو نافذ کرنے اور ریاست کی حیثیت کو تبدیل کرنے کے بارے میں بھی کچھ کہا۔ ان میں سے بعض امور کی طرف وہ امر کو بار بار متوجہ کرتے رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت مجددؑ اور جہاں گیر سے متعلق تاریخ کے بنیادی مصادر میں ایسا مواد نہ ہونے کے برابر ہے، جس سے یہ پتا چلتا ہو کہ حضرت مجددؑ کے زیر اثر جہاں گیر نے مغل سلطنت کی حیثیت ترکیبی میں کوئی بنیادی تبدیلی کی ہو، ہندوؤں کے اثر و اقتدار کو توڑنے کی کوئی شعوری کوشش کی ہو، یا اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے عملی اقدامات کیے ہوں۔ چنانچہ جب ۱۶۳۳ میں حضرت مجددؑ نے وفات پائی تو مغل سلطنت اسی طرح ایک غیر اسلامی اور غیر مذہبی مغل سلطنت تھی، جس کا سربراہ ایک پیدائشی مسلمان تھا، جسے نفاذ اسلام کے بجائے استحکام سلطنت سے دلچسپی تھی، چاہے اس کے دست و بازو ہندو ہوں یا مسلمان، اور یہ کلم ہندوؤں کے خون کی قیمت چکا کر کیا جائے یا مسلمانوں کے۔ ان حالات میں حضرت مجددؑ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عوام و خواص کو اسلام کے چشمہ صافی کی طرف بلایا، اور اس کے اثرات یقیناً محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

حضرت مجددؑ کی وفات کے تین سال بعد جہاں گیر کا انتقال ہوا (۱۶۳۷ء) تو امرا کی مشاورت کے ساتھ شہزادہ خرم (شاہ جہاں) تخت نشین ہوا۔ بعض سوانح نگاروں کے مطابق وہ حضرت مجددؑ کا پہلے ہی سے معتقد تھا اور غالباً آپ سے بیعت ہو چکا تھا۔ بادشاہ بننے کے بعد اس نے آپ کے صاحب زاوے خواجہ محمد معصوم سے تجدید بیعت کی۔ اس نے بعض بدعتیں، سرکاری احکام کے ذریعے ختم کرائیں، ”سکے پر کلمہ طیبہ کی مہر

جاری کی، تین لاکھ مساجد اور ایک لاکھ مدرسے تعمیر (یا مرمت) کرائے۔ علامہ فقرا کے وظائف مقرر کیے اور دین اسلام کی ترویج کی بہت کوشش کی۔^{۱۳} سکے پر کلہ طیبہ کا اندراج، گویا حکومت کے کلہ پڑھ لینے کے مترادف تھا۔ کہتے ہیں کہ مغرب کی اذان سن کر غلٹ میں بیڑھیوں سے اتر رہا تھا کہ پیر رہنا، اور یوں اس کا انتقال ہوا، جب کہ والد محترم کثرت شراب نوشی کا شکار ہوئے تھے۔

شاہ جہاں کے بعد اس کے بیٹے محی الدین اورنگ زیب عالم گیر (حکومت ۱۶۵۸-۱۷۰۷) نے سلطنت سنبھالی۔ روایت کے مطابق وہ بھی خواجہ محمد معصوم کے معتقد اور ان سے بیعت تھے۔^{۱۴} ان کے دور حکومت کو سارے مغل عہد میں سب سے زیادہ ”اسلامی“ کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بلوشتانی میں درویشی اختیار کی، ذاتی زندگی میں سلوگی کو شعار بنایا، احکام شرع کو قانوناً رواج دیا، اور اس کے لیے فتاویٰ علامگیری مرتب کرائی۔ تاہم ان کے جانشین نالائق نکلے، اور سلطنت مغلیہ اس سترے دور کے بعد زوال پذیر ہوتی گئی۔

تاریخ کے اس عہد میں، جسے ایک لحاظ سے ”پادشاہوں کا زمانہ“ کہا جا سکتا ہے، حضرت مجددؒ کسی جمہوری سیاسی تحریک کے ذریعے اصلاح نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کے موجود لوہاروں کے ذریعے بیعت و ارشاد، تعلیم و تربیت اور اصلاح و تجدید کی کوشش کی۔ اور اس دعوے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ برصغیر کو ایک غیر مسلم ملک بننے سے بچالیا۔ اقبال نے درست ہی کہا ہے:-

گردن نہ جھکی جس کی جہاں گیر کے آگے جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار
وہ ہند میں سرمایہ ملت کا جھبہاں اللہ نے بروقت کیا جس کو خبروار^{۱۵}

حواشی

۱۔ حضرت مجددؒ ۱۵۶۳/۱۵۸۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۶۲۳/۱۶۰۳ء میں وفات پائی۔ اس طرح قمری تقویم کے مطابق آپ نے ۶۳ سال کی عمر پائی اور شمسی تقویم کے مطابق ۶۰ سال کی۔

۲۔ بدایونی، ملا عبد القادر، مستقبح التواریخ، ص ۲۱۵

۳۔ ایضاً، ص ۲۱۵

۴۔ محمد ہاشم کشمیری: زبدة المقامات (ترجمہ: مطبوعہ نول کشور) ص ۱۳۱

۵۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۶۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ابوالفضل کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

۷۔ Cambridge History of India، ج ۳، ص ۱۵۰

۸۔ مکتوبات دفتر اول، رقم ۳۷ (۱:۳۷)

۹۔ ایضاً، ۱:۳۷

۱۰۔ ایضاً، ۲:۹۲

۱۱۔ شیخ محمد اکرام نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ حضرت مجددؒ کے ایک پر جوش مرید اور مبلغ، شیخ بدیع الدین، حضرت کی دربار میں طلبی اور پھر قید کا باعث ہوئے۔

۱۲۔ یہ بات قابل غور ہے کہ قلعہ گوالیار سے رہائی کے بعد بھی جہاں گیر حضرت مجددؒ کو اپنے دربار اور ”لشکر“ میں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا، کہ کہیں پھر ”شورش عوام“ کا باعث نہ بنیں۔ اور وفات سے صرف چند ماہ قبل ہی انھیں بقول ان کے ”مگر فاری لشکر“ سے رہائی نصیب ہوتی ہے۔

۱۳۔ پروفیسر محمد فرمان: صحاح مجددؒ، مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۸ء، ص ۳۵-۳۶

۱۴۔ پروفیسر محمد فرمان، ۳۶، شیخ محمد اکرام ۲۷۳

۱۵۔ توڑکا جہاں گیری، ص ۶۵۱

۱۶۔ توڑکا، ص ۵۲۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۷-۲۲۶

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۶-۲۲۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۸۵۳

۲۰۔ شاہ جہاں سے ناراض ہو کر وہ اسے ”بے دولت“ کا خطاب دیتا ہے، ایضاً ۷۲۳

۲۱۔ ایضاً، ص ۸۲۸، نیز ۸۲۳

۲۲۔ سید زوار حسین شاہ: حضرت مجدد الف ثانی، ص ۲۱۳

۲۳۔ ایضاً، ص ۷۰۶

۲۴۔ ایضاً، ص ۷۰۷

۲۵۔ بال جبریل، پنجاب کے پیرزادوں سے، ص ۱۵۹